مہمانوں کے حقوق اور کارکنان جلسہ کو نصائح

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۲۴؍دسمبر ۱۹۸۲ء بمقام مسجد اقصیٰ ربوہ)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

جلسہ کا وقت جتنا قریب سے قریب تر آتا چلا جار ہا ہے اُسی قدر وقت کی رفتار بھی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں جلسہ قریب آیا وقت نے چلتے چلتے دوڑنا شروع کیا اور اب دوڑتے دوڑتے اُڑنے لگا ہے۔ اور جب جلسہ آجاتا ہے تو پتہ بھی نہیں لگتا کہ چلا کب گیا۔ اس تیزی سے وقت گزر جاتا ہے کہ کارکنان جلسہ جو مختلف قسم کے فکروں میں مبتلا ہوتے ہیں کہ مشکل ذمہ داریاں کیسے ادا ہوں گی وہ آنِ واحد میں ادا ہو بھی جاتی ہیں اور معلوم بھی نہیں ہوتا کہ جلسہ کب آیا تھا اور کب چلا گیا۔

اور جب جلسہ آ کے چلا جاتا ہے تو اپنے پیچھے ایک بڑی گہری اداسی چھوڑ جاتا ہے۔ ایسی گہری اُداسی کہ ربوہ کے در و دیوار سے اُس وقت اداسی ٹپک رہی ہوتی ہے۔

پہلے جب قافلے آکر جایا کرتے تھے اور نعرہ ہائے تکبیر سے بعض لوگوں کی دل آزاری نہیں ہوتی تھی اور بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے جب گاڑیاں روانہ ہوتی تھیں تو میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ بہت سے کارکنان دورویہ کھڑے خاموشی سے آنسو بہا رہے ہوتے تھے۔ اتنا گہرا دُکھ مہمان پیچھے چھوڑ جاتے تھے کہ باہر کی دنیا اسکا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

میں نے سوچا کہ یہ جذبہ اور یہ خُلق کہاں سے ہم نے پایا تو ذہن حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے اس مصرعہ کی طرف منتقل ہوا۔

ع پَر دل کو پہنچے غم جب یاد آئے وقتِ رخصت

کہ ابھی تو مہمانوں کی آمد آمد ہے لیکن ایک عارف باللہ اور مہمان نوازی کے اعلیٰ خُلق پر فائز ایک انسان اُن کے جانے کے بعد جو غمگین ہوتا تھا وہ تو ہوتا تھا ابھی وہ وقت آیا ہی نہیں تو اس غم کا احساس پہلے ہی دل میں جنم لے چکا ہوتا تھا۔

پس آپ ہی کے ادنیٰ غلاموں کا مہمانوں کے جانے پر غم محسوس کرنا یہ تو ایک روایت ہے جو ہم نے ورثہ میں پائی ہے۔ انسانی فطرت تو ایک ہی رہتی ہے۔ البتہ بچہ میں اس کا اظہار مختلف طریق پر ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ایک بھانجے قمر سلیمان احمد جو آج کل نائیجیریا میں لیکچرر ہیں ہم انہیں پیار سے بی کہتے ہیں۔ وہ بچپن میں جب انڈا کھایا کرتے تھے تو ان کو انڈا اتنا پسند تھا کہ کھاتے کھاتے ابھی نصف تک نہیں پہنچا ہوتا تھا تو رونے لگ جاتے تھے اور ہم جان کر چھیڑنے کی خاطر (ان کا جواب بڑا پیارا لگا کرتا تھا) ان سے پوچھتے تھے کہ بی روتے کیوں ہو۔ تو وہ جواب دیتا تھا کہ انڈا ''چم'' ہو جائے گا یعنی ''ختم'' بھی نہیں کہہ سکتا تھا اتنی چھوٹی عمر کا واقعہ ہے کہ مجھے یہ غم لگ گیا ہے کہ یہ انڈا جو شروع کر بیٹھا ہوں یہ تو ختم ہو جائے گا۔

دراصل ساری زندگی کا فلسفہ یہی ہے۔ جو چیز آتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے اور اسی فلسفہ کا نام زندگی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو پھر دکھ بھی ختم نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کیسا عدل قائم کر رکھا ہے۔ خوشیاں بھی آتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ بڑے بڑے دکھ بھی آتے ہیں جن سے انسان سمجھتا ہے کہ میں کبھی گزر ہی نہیں سکوں گا، وہ بھی آ کر ختم ہو جائیں گے۔ اسی طرح تکلیفوں کے ادوار بھی آنی جانی بات ہے۔ زندہ اور عارف قومیں جانتی ہیں کہ یہ وقتی تکلیفیں اور یہ آزمائشیں سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ یہ گزر جائیں گی۔ ان کو دوام نہیں ہے۔ کیونکہ تقدیر الٰہی اسی طرح جاری وساری ہے۔

پس ان چیزوں سے جہاں غم بھی پہنچتا ہے وہاں حوصلے بھی بڑے بلند ہوتے ہیں۔ یقین اور عزم بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس تعارف کے بعد اب میں ایک دو باتیں جلسہ کی ذمہ داریوں سے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ جن میں آنے والے اور جانے والے سبھی شریک ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ چونکہ غیر معمولی طور پر آبادی بڑھنے کی وجہ سے سڑکوں پر ہجوم ہو جاتا

ہے۔ بعض دفعہ ایک انبوہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں یاد کرانا چاہتا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ نے سڑکوں کے جو حقوق بیان فرمائے ہیں اُن کا خیال رکھیں۔ اسلام ایک کامل مذہب ہے۔ ہر چیز جو بنی نوع انسان کی زندگی سے کسی رنگ میں بھی تعلق رکھتی ہے اس کے متعلق اس میں کامل تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ سڑکوں اور بازاروں کے حقوق بھی قائم کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ان حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ بازاروں میں مجلسیں نہ لگائی جائیں۔ کیونکہ جب بازاروں میں مجلسیں لگتی ہیں تو اس سے معاشرہ میں کئی قسم کی برائیاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر آنے جانے والے مسافر جن کی خاطر بازار بنائے گئے تھے کہ وہ ان میں خرید وفروخت کریں، ان کے اصل کام میں یہ مجلسیں مخل ہو جاتی ہیں۔ پس جو چیز اصل میں مخل ہو اس کا نام غیر منصفانہ فعل ہے۔ تو بازاروں کا حق یہ ہے کے آپ اتنی دیر وہاں رہیں جتنی دیر رہنا ضروری ہے۔ اتنی دیر ہوٹلوں میں بیٹھیں جتنی دیر ہوٹل میں بیٹھنا ضروری ہے۔ وہاں مجلسوں کے اڈے نہ بنائیں اور اگر کبھی کچھ دیر کے لیے رکنا پڑے (بعض دفعہ لازماً رکنا پڑتا ہے) تو اس وقت بھی ذکر الٰہی میں مصروف رہیں۔ دین کی باتیں کریں تا کہ ربوہ کا ماحول اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مہک اٹھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب آپ بازاروں میں چلتے ہیں تو کارکن آپ کو یہ کہتے ہیں کہ یہ رستہ اختیار کریں اور وہ اختیار نہ کریں۔ ایسی صورت میں دو قسم کی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات کارکنان تحکم اختیار کر لیتے ہیں۔ محبت اور عاجزی سے سمجھانے کی بجائے وہ تحکمانہ رنگ اختیار کرتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں وہ لوگ بھی جن کو تعاون کی عادت ہے بعض دفعہ مزاج کی وجہ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج بے شمار قسموں کے پیدا کیے ہیں۔ بعض لوگ بڑی جلدی بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کا بیماریوں سے بھی تعلق ہوتا ہے مثلاً کسی کو ہائی بلڈ پریشر ہے۔ وہ بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اور پھر بڑی بڑی سخت باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔ تو اوّل تو کارکنان کو تہذیب اور اخلاق کے دائرے میں رہنا چاہئے اور جہاں تک ممکن ہو محبت اور پیار کے ساتھ سمجھائیں۔ رستہ سب کے درمیان ایک مشترک چیز ہے۔ اس لیے انتظامی دقتوں کے پیش نظر اگر ہمیں بعض لوگوں سے درخواست کرنی پڑتی ہے کہ تھوڑی دیر ٹھہریں یا اس طرف چلیں اور اس طرف نہ چلیں۔ مستورات کی طرف نہ چلیں۔ مردوں کی طرف چلیں۔ یہ ان کی سہولت کی خاطر ہے۔ اور رستہ کے حقوق میں یہ

بات اس لیے داخل ہے کہ رستہ کے حقوق کا فلسفہ یہ ہے کہ ہر آنے جانے والے کے لیے آسانی پیدا کی جائے۔ پس اجتماعی آسانی پر انفرادی آسانیوں کو قربان کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ انتظامات کسی تحکم کے، کسی زبردستی کے کسی شاہی فرمان کے مظہر نہیں ہوتے بلکہ عوامی بہبود کے لیے بعض افراد سے درخواست کی جاتی ہے کہ آپ اجتماعی طور پر اپنے نفس کو قربان کریں۔ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے ایک ادنیٰ چیز کی قربانی دینا یہ زندگی کا ایک بنیادی فلسفہ ہے۔ پس جب اجتماعیت کے مقابل پر انفرادیت آئے گی۔ تو انفرادیت کو قربان ہونا پڑے گا۔ لیکن بحیثیت مجموعی اجتماعیت کی حفاظت بھی افراد کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ اجتماعیت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جو افراد سے کلیتہً الگ کوئی اوپر کی فضا میں بس رہی ہو۔ گویا آپ کے سارے فائدے اجتماعیت کو پہنچ رہے ہیں اور آپ محروم رہ رہے ہیں۔ ہرگز ایسی بات نہیں ہے۔ اجتماعی فائدہ سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد بشر کو فائدہ پہنچے، ایک شخص اُس محدود فائدہ سے زیادہ استفادہ نہ کر جائے اور باقیوں کے حصہ کو نقصان نہ پہنچ جائے۔ تو بالآخر یہ فائدہ ہر فرد کی طرف ہی لوٹتا ہے۔ اس لیے تعاون کی رُوح ہی بہتر ہے اور آپ کے اپنے مفاد کے اندر ہے۔

اس سلسلہ میں میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ ایسے لوگ بھی آئے ہوں جو حسن اخلاق سے بات کرنے کے باوجود بھی بھڑک اٹھیں اور کہیں ہم نے جانا ہے تو ان کو جانے دیجئے۔ جب تک حکومت رستہ کے اوپر ایسی پابندیاں عاید نہ کرے کہ فلاں رستے سے فلاں کا گزرنا ضروری ہے فلاں کا گزرنا ضروری نہیں جو پبلک جگہیں ہیں جو ہماری جائیداد نہیں ہیں مثلاً یہ جلسہ گاہ ہماری جائیداد ہے۔ یہاں ہمیں انتظام کرنے کا پورا حق ہے۔ مگر سڑکیں تو ہماری جائیداد نہیں ہیں۔ وہاں ایسی صورت میں آپ کو اپنے دائرہ اختیار سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ حکومت کے متعلقہ ادارے ہیں آپ ان سے تعاون کریں۔ اُن سے تعاون حاصل کریں اور بجائے اس کے کہ قانون اپنے ہاتھ میں لیں ایسے مسائل ان کی طرف منتقل کیا کریں۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا اسلام کی اخلاقی تعلیم کے بھی خلاف ہے۔ اور حکمت کے بھی خلاف ہے۔

تیسری بات اس ضمن میں میں یہ کہوں گا کہ اُس وقت اگر کوئی تلخی کے ساتھ بولتا ہے تو کارکنان تلخی نہ دکھائیں۔ پیار اور محبت کے ساتھ سمجھائیں۔ صبر کے اندر بڑی طاقت ہے۔ انکسار میں ایک بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اگر انکسار اور تکبر کا مقابلہ ہو تو اگر صبر ساتھ شامل ہو جائے تو لازماً

انکسار جیتا کرتا ہے اس لیے اپنے اندر اخلاق کی یہ دو اعلیٰ قدریں پیدا کریں۔ صبر تحمل اور پورے حلم کے ساتھ آپ انکسار کو اختیار کریں گے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔

جہاں تک مہمانوں کے عمومی حقوق کا تعلق ہے اس میں حفاظتی نقطہ نگاہ بھی شامل ہے۔ بعض اوقات ہم نے دیکھا ہے جلسہ سالانہ پر بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ میلا ٹھیلا ہے لوگ غافل ہوں گے، اُن کو لوٹنے کے لیے آجاتے ہیں۔ چنانچہ مجھے یاد ہے ایک دفعہ جلسہ سالانہ کے موقع پر بہت سے جیب کُترے ربوہ میں آگئے۔ اُن کا ایک باقاعدہ منظم گروہ تھا۔ ایک دو دن ہمیں بڑی مشکل پڑی رہی۔ یہاں تک اس محاورہ کے مطابق کہ Let a thief to catch a thief کہ چوروں کو پکڑنے کے لیے چور کو ہی ملازم رکھا جائے۔ وہ چور کی ادائیں سمجھتا ہے تو ایک ایسا شخص قابو آیا جو کسی زمانہ میں اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے چند منٹوں کے اندر اندر سارے جیب کترے پکڑوا دیے۔

بات یہ ہے کہ اس موقع پر اَور بھی کئی قسم کے خطرات پیدا ہو سکتے ہیں کئی قسم کی بدنیتیں لے کر لوگ یہاں آتے ہیں۔ چور اُچکے، اٹھائی گیر اور کئی بدنی طور پر نقصان پہنچانے اور فتنے پیدا کرنے والے آجاتے ہیں۔ ان سب کے خلاف آپ کو پوری طرح شعور کے ساتھ چوکس اور بیدار رہ کر وقت گزارنا چاہئے۔ اس ضمن میں سب سے اہم دفاع تو دعا ہے۔ کیونکہ دعا کی برکت شامل ہو تو اکثر مخالفانہ تدبیریں خود ہی باطل ہو جایا کرتی ہیں۔ پتہ اس وقت لگتا ہے جب وہ ناکام ہو چکی ہوتی ہیں۔ دعا نہ ہو تو معمولی معمولی تدبیریں بڑے بڑے حادثوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے دوست بکثرت دعائیں کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام مخفی خطرات سے محفوظ و مامون رکھے۔

دوسرے ہر شخص باشعور طور پر آنکھیں کھول کر بیدار رہے۔ ہمارے آقا حضرت محمد مصطفی ﷺ نے تو مومن کی نظر کی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ مومن کی نظر گہرائی میں سرایت کر جاتی ہے اور مخفی چیزوں کو پا جاتی ہے۔ اس لیے ہر مومن کو اپنی بصیرت کو اور اپنی بصارت کو تیز کرنا چاہئے اور ہوشیار رہنا چاہئے اور باخبر رہنا چاہئے کہ ماحول میں کیا ہو رہا ہے۔ اجنبی آدمی کو بلا وجہ مجرم سمجھنا تو کوئی ذہانت نہیں۔ لیکن اجنبی کو تکلیف دیے بغیر اس کے احتمالی خطرہ سے محفوظ رہنا ذہانت ہے۔ بعض دفعہ اجنبی آدمی سے جب بات کی جائے، اس سے گفتگو کی جائے تو یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اُس کی کوئی ضرورت آپ کے سامنے آجاتی ہے۔ یعنی یہ بات بدظنی پر مبنی نہیں ہے کہ آپ کسی

اجنبی سے پوچھیں۔ آپ کون ہیں کہاں سے آئے ہیں۔ کیا بات ہے۔ واقعتہً آپ جب اس سے بات کرتے ہیں۔ اس سے تعلق بڑھاتے ہیں تو دو فائدے پہنچتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر وہ بدنیتی سے آیا ہو تو آپ کو معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ایک ذہین آدمی سمجھ جاتا ہے اور اگر خود ضرورت مند ہو تو اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

دنیا میں آزاد ممالک میں جو پولیس فورسز ہیں وہ اسی اصول پر کام کر رہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ ہمیں خود اس کا تجربہ ہوا میں ۱۹۷۸ء میں جب امریکہ گیا تو شکاگو سے ہمیں ایک اور شہر جانا تھا۔ شکاگو بہت بڑا شہر ہے۔ اس میں ٹریفک بھی بہت زیادہ ہے۔ ہم نے چھ بجے نکلنا تھا لیکن نکلتے نکلتے رات کے نو بج گئے۔ جہاں پہنچنا تھا وہ کئی سو میل کا فاصلہ تھا۔ رات کے تقریباً دو بج گئے جب کہ ابھی ہم اپنی منزل پر بھی نہیں پہنچے تھے اس لیے ہم نے فیصلہ یہی کیا کہ تھوڑی دیر کہیں آرام کیا جائے۔ ہم ایک شہر میں موٹر آہستہ کر کے جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ چونکہ نسبتاً چھوٹا قصبہ تھا اس لیے جلدی سو گیا تھا ورنہ امریکہ کے بعض شہر تو دو تین بجے تک آرام سے جاگتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ ایک موٹر میرے پیچھے لگ گئی ہے۔ چنانچہ میں نے اس کو ڈاج دینے کی بہت کوشش کی۔ جس طرف میں مڑتا تھا وہ پیچھے آ جاتی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اب کھل کر بات ہونی چاہئے۔ اگر کوئی شریر آدمی ہے تو پھر ٹھیک ہے اس کو شرارت کا موقع اسی شہر میں ملے باہر نکل کر پھر کیوں ملے۔ چنانچہ میں نے موٹر روکی اور اُتر کر اسکی طرف گیا تو اندر سے ایک پولیس والا اترا۔ اس نے سلام کر کے بڑی معذرت سے کہا کہ آپ کو تکلیف دینا مقصود نہیں ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا بات ہے۔ آپ کیوں آہستہ آہستہ جگہ جگہ پھر رہے ہیں کوئی مقصد نظر نہیں آ رہا۔ اس نے بڑے اخلاق سے بات کی۔ اس کا مقصد بھی پورا ہو گیا اور میرا مقصد بھی پورا ہو گیا۔ میں نے اس کو کہا کہ ہم سونے کے لیے جگہ ڈھونڈ رہے ہیں کوئی جگہ مل نہیں رہی۔ اس نے کہا میرے ساتھ تشریف لائیں۔ میں ابھی آپ کو جگہ دلوا دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ ان جگہوں کو جانتا تھا۔ وہ ہمیں وہاں لے کر گیا اور رات ٹھہرنے کی بڑی اچھی جگہ مہیا کر دی۔

آجکل کی ترقی یافتہ قوموں میں رفتہ رفتہ بعض اخلاق بھی ترقی کر گئے ہیں۔ ان میں سے حسن معاشرت کا ایک خُلق ہے۔ آپ تو پہلے ہی بہت ترقی یافتہ قوم ہیں اتنی ترقی یافتہ کہ حضرت محمد

مصطفیٰ ﷺ نے آپ کو حسن خلق اور حسن سیرت خود سکھایا ہے۔ میں یہ مثالیں اس لیے نہیں دے رہا کہ آپ ان کی پیروی کریں۔ میں تو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کی طرف آپ کو توجہ دلاتا ہوں۔ اور آپ کو بتا یہ رہا ہوں کہ وہ سنت ایسی پیاری سنت ہے کہ جب غیر بھی اس کی پیروی کرتے ہیں تو ایک حسن پا جاتے ہیں تو اپنوں کو تو زیادہ توجہ اور زیادہ خلوص کے ساتھ اس سنت کی پیروی کرنی چاہئے۔ اس لیے اس پہلو سے بیدار مغزی کے ساتھ ہر ناواقف سے رابطہ پیدا کریں جس کے متعلق آپ کو یہ خیال ہے کہ بے مقصد پھر رہا ہے۔ اس کا خیال رکھیں اور اگر اس کی کوئی ضرورت ہے تو وہ پوری ہونی چاہئے۔ اسی طرح اگر کوئی قابل فکر بات سامنے آئے تو متعلقہ افسران کے پاس وہ بات پہنچانی چاہئے لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ پس ایک یہ پہلو ہے جس میں ہم سب مل کر مہمان بھی اور میزبان بھی خدمت کر سکتے ہیں۔

اسی ضمن میں میں ایک اور بات بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بعض مہمان اپنی سادگی میں لُوٹے جاتے ہیں۔ حالانکہ مومن کو اس قسم کی سادگی زیب نہیں دیتی۔ مہمان نوازی کے انتظام کے ساتھ منسلک رہنے کی وجہ سے مجھے تجربہ ہے۔ میرے سامنے کئی ایسی باتیں آئیں جن کی وجہ سے بڑی تکلیف پہنچی کہ بعض احمدی مہمانوں نے اپنی سادگی میں بڑا بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ایک بیچارہ احمدی تقریریں ریکارڈ کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر لے کر آیا ہوا تھا۔ وہ ٹیپ سن رہا تھا۔ ایک آدمی دوڑا دوڑا آیا اور اس سے کہا کہ آپ کے فلاں دوست جو آپ کے ساتھ فلاں جگہ باتیں کر رہے تھے وہ کہتے ہیں کہ ذرا تھوڑی دیر کے لیے ٹیپ ریکارڈر دے دیں۔ اس نے اسی وقت پکڑا دیا۔ حالانکہ وہ آدمی نہ دیکھا نہ جانا۔ ٹیپ ریکارڈر لے کر غائب ہو گیا۔ وہ جب اپنے دوست سے ملا تو اس نے کہا۔ تم نے تھوڑی دیر کے لیے ٹیپ ریکارڈر مانگا تھا واپس تو کرو۔ اس نے کہا کیسا ٹیپ ریکارڈر۔ مجھے تو پتہ ہی کچھ نہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسی قسم کے واقعات اور جگہ بھی ہوئے۔ تو بہت سے مہمانوں کا سادگی میں نقصان ہو گیا۔ ایک آدمی ایک قیام گاہ میں آیا کہ فلاں مہمان صاحب ہیں ان کی بس جا رہی ہے اور وہ اپنا بستر اور سامان چھوڑ گئے ہیں۔ وہ فوری طور پر دے دیں۔ وہ خود آ نہیں سکتے میں لینے آ گیا ہوں۔ اس وقت جو سارے میزبان یا مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔ اسی وقت بستر وغیرہ اٹھوا دیئے اور وہ اور صاحب تھے جو سامان اٹھا کر بھاگ گئے۔ اس لیے ان معنوں

میں بھی بیدار مغزی کی ضرورت ہے۔ اپنے سامان کی حفاظت خود کریں۔ اتنے بڑے انتظامات میں انتظامیہ پر پورا پورا انحصار کرنا کہ وہ اس قابل ہوگئی ہے کہ آپ کی ہر طرح مدد کر سکے یہ تصور ہی غلط ہے۔ آپ خود اپنا جو نقصان کریں گے اس میں انتظامیہ کچھ نہیں کر سکتی۔ انتظامیہ کی انشاء اللہ تعالیٰ پوری کوشش تو ہے لیکن اس کی حدود ہیں لیکن جہاں آپ کی حدود شروع ہو جاتی ہیں وہاں انتظامیہ دخل نہیں دے سکتی۔ پس آنے والے مہمان خصوصیت کے ساتھ ان باتوں میں بھی بیدار مغز رہیں۔

آخری بات جو میں کہنی چاہتا ہوں وہ مہمان نوازی سے تعلق رکھتی ہے۔ مہمان نوازی سے متعلق مختلف باتیں میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں لیکن ایک دو باتیں ایسی ہیں جو مہمان نوازی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے اہل ربوہ کو عمومی تحریک کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مہمان نوازی کا جو معیار ہمارے سامنے رکھا ہے وہ بار بار جماعت کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔ تا کہ اس اعلیٰ معیار کو پیش نظر رکھ کر ہم اپنی تربیت کریں۔ چنانچہ حضرت منشی ظفر احمد صاحب کپورتھلویؓ بیان فرماتے ہیں:

”ایک دفعہ دو شخص منی پور آسام سے قادیان آئے اور مہمان خانہ میں آ کر انہوں نے خادمانِ مہمان خانہ سے کہا کہ ہمارے بستر اتارے جائیں اور سامان لایا جائے۔ چارپائی بچھائی جائے۔“

کئی دفعہ یہاں بھی ایسا ہو جاتا ہے۔ مجھے علم ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے لمبی تربیت کے نتیجہ میں اب کارکنان دوڑ دوڑ کر سامان اٹھاتے ہیں اور اتارتے ہیں۔ یہ عذر پیش نہیں کرتے کہ ہم مزدور نہیں ہیں۔ مزدور لے کر آؤ یا خود اتارو مگر اس زمانہ میں مہمان خانہ کے جو ملازم تھے یا تو شاید نئے تھے یا ان کی ابھی پورے طور پر تربیت نہیں ہو پائی تھی اس لئے:

”خادموں نے کہا آپ خود اپنا سامان اُتروائیں۔ چارپائیاں بھی مل جائیں گی۔ دونوں مہمان اس بات پر رنجیدہ ہو گئے اور فوراً یکہ میں سوار ہو کر واپس روانہ ہو گئے۔ حضرت منشی ظفر احمد صاحبؓ کہتے ہیں۔ میں نے مولوی عبدالکریم صاحبؓ سے یہ ذکر کیا تو مولوی صاحب فرمانے لگے جانے بھی دو ایسے جلد بازوں کو۔ حضورؑ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو نہایت جلدی سے ایسی حالت

میں کہ جوتا پہننا بھی مشکل ہو گیا۔ حضورؑ ان کے پیچھے نہایت تیز قدم چل پڑے۔ چند خدام بھی ہمراہ تھے میں بھی ساتھ تھا۔ نہر کے قریب پہنچ کر ان کا یکہ مل گیا اور حضورؑ کو آتا دیکھ کر وہ یکہ سے اتر پڑے اور حضورؑ نے انہیں واپس چلنے کے لئے فرمایا۔ کہ آپ کے واپس ہونے کا مجھے بہت درد پہنچا ہے چنانچہ وہ واپس ہوئے۔ حضورؑ نے یکہ پر سوار ہونے کے لئے انہیں فرمایا اور فرمایا کہ میں ساتھ ساتھ چلتا ہوں مگر وہ شرمندہ تھے اور وہ سوار نہ ہوئے اس کے بعد مہمان خانہ میں پہنچے۔ حضورؑ نے خود ان کے بستر اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر خدام نے اتار لیا۔ حضورؑ نے اسی وقت دو نواری پلنگ منگوائے اور ان پر ان کے بستر کرائے۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ کیا کھائیں گے اور خود ہی فرمایا کیونکہ اُس طرف چاول کھائے جاتے ہیں اس لئے میں چاول خود ہی بھجوا دوں گا اور رات کو دودھ کے لئے پوچھا۔ غرضیکہ ان کی تمام ضروریات اپنے سامنے مہیا فرمائیں اور جب تک کھانا آیا وہیں ٹھہرے رہے۔ اس کے بعد حضورؑ نے فرمایا کہ ایک شخص جو اتنی دور سے آتا ہے۔ راستہ کی تکالیف اور صعوبتیں برداشت کرتا ہے یہاں پہنچ کر سمجھتا ہے کہ اب میں منزل پر پہنچ گیا ہوں۔ اگر یہاں آکر بھی اس کو وہی تکلیف ہو تو یقیناً اس کی دل شکنی ہوگی۔ ہمارے دوستوں کو اس کا خیال رکھنا چاہئے۔ اس کے بعد جب تک وہ مہمان ٹھہرے رہے حضورؑ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ ایک گھنٹے کے قریب ان کے پاس آکر بیٹھتے اور تقریر وغیرہ فرماتے۔ جب وہ واپس ہوئے تو صبح کا وقت تھا، حضورؑ نے دو گلاس دودھ کے منگوائے اور انہیں فرمایا یہ پی لیجئے اور نہر تک انہیں چھوڑنے کے لئے ساتھ گئے۔ راستہ میں بار بار ان سے فرماتے رہے کہ آپ تو مسافر ہیں آپ یکہ میں سوار ہو لیں مگر وہ سوار نہ ہوئے۔ نہر پر پہنچ کر انہیں سوار کرا کر حضور واپس تشریف لائے۔‘‘

(اصحاب احمد جلد چہارم صفحہ ۱۲۰۔۱۱۹)

حضرت منشی ظفر احمد صاحب کپورتھلویؓ کی ایک اور روایت بھی ہے اور اس روایت کا تو

خاص طور پر جلسہ سالانہ سے ہی تعلق ہے وہ کہتے ہیں:

''ایک دفعہ جلسہ سالانہ پر بہت سے آدمی آئے تھے جن کے پاس کوئی پارچہ سرمائی نہ تھا۔''

ایسا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ چند سالوں سے مہمان نوازی کا شعبہ چونکہ میرے سپرد تھا۔ ہم نے یہ انتظام کیا کہ اردگرد کی جماعتوں سے بستر منگوا کر یہاں رکھے جائیں۔ تاکہ کچھ مہمان جو بغیر بستر کے آجاتے ہیں۔ (مثلاً افغانستان سے بعض مہمان بغیر بستر کے آئے تھے ان کے لئے بستر اٹھانا مشکل تھا) ان کے بستر مہیا کئے جائیں۔ اسی طرح افسر صاحب جلسہ سالانہ نے بہت سے زائد بستر بنوا کر رکھے ہوتے ہیں وہ سارے ختم ہونے کے باوجود جو زائد انتظام تھا وہ بھی بیچ میں کام آگیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کے نتیجہ میں مہمانوں کو تکلیف نہیں پہنچی۔ ایسا ہوجاتا ہے لیکن آنے والے مہمانوں کو بھی خیال کرنا چاہئے کہ اب جلسے کی حدود پھیل گئی ہیں اور جلسہ کا نظام اتنی وسعت اختیار کر چکا ہے کہ اب کسی میزبان کے بس میں نہیں رہا کہ وہ خواہش بھی کرے تب بھی ان کی بستروں کی ضروریات کماحقہ پوری کردے۔ اس لئے اپنی تکلیف کی خاطر اور کچھ میزبانوں کی تکلیف کی خاطر کہ جو میزبان یہ دیکھتا ہے کہ میں اپنے مہمانوں کی ضرورت پوری نہیں کرسکتا اسے بڑی شدید تکلیف پہنچتی ہے وہ بڑا دکھ محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ اس تکلیف کی خاطر مہمان حتی المقدور اپنے بستر ساتھ لایا کریں۔ بہرحال جو روایت میں پڑھ رہا ہوں اس میں یہ ذکر آتا ہے کہ ایسے مہمان آگئے جن کے پاس بستر نہیں تھے چنانچہ:

> ''ایک شخص نبی بخش نمبردار ساکن بٹالہ نے اندر سے لحاف بچھونے منگوانے شروع کئے اور مہمانوں کو دیتا رہا۔ میں عشاء کے بعد حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ بغلوں میں ہاتھ دیے بیٹھے تھے اور ایک صاحبزادہ جو غالباً حضرت خلیفۃ المسیح الثانی تھے پاس لیٹے تھے اور ایک چوغہ انہیں اوڑھا رکھا تھا۔ معلوم ہوا کہ آپ نے بھی اپنا لحاف بچھونا طلب کرنے پر مہمانوں کے لئے بھیج دیا۔ میں نے عرض کی کہ حضور کے پاس کوئی پارچہ نہیں رہا اور سردی بہت ہے۔ فرمانے لگے کہ مہمانوں کو تکلیف نہیں ہونی چاہئے اور ہمارا کیا ہے رات گزر جائیگی نیچے آکر میں نے نبی بخش نمبردار کو بہت برا بھلا کہا کہ تم

حضرت صاحب کا لحاف بچھونا بھی لے آئے وہ شرمندہ ہوا اور کہنے لگا کہ جس کو دے چکا ہوں اس سے کس طرح واپس لوں۔ پھر میں مفتی فضل الرحمٰن صاحب یا کسی اور سے ٹھیک یاد نہیں رہا۔ لحاف بچھونا مانگ کر اوپر لے گیا۔ آپ نے فرمایا کسی اور کو دے دو۔ مجھے تو اکثر نیند بھی نہیں آیا کرتی اور میرے اصرار پر بھی آپ نے نہ لیا اور فرمایا کسی مہمان کی ضرورت پوری کریں۔''

(اصحاب احمد جلد چہارم صفحہ ۱۳۵)

مہمان نوازی کا ایک یہ معیار ہے جو ہمارے سامنے ایک منصب بن کر، ایک مقصود بن کر چمک رہا ہے۔ اس معیار کے قریب ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب یہ مثالیں عام ہوگئی ہیں۔ گزشتہ تجربوں کی بنا پر میں یقین کے ساتھ بتا سکتا ہوں کہ ربوہ میں ہی ایسی مثالیں ہیں کہ گھر چھوڑ کر باہر نکل کر لوگ صحنوں میں سوئے اپنے بستر مہمانوں کو دے کر اور اپنے ہاتھ بغلوں میں دبا کر رات گزاری۔ کارکنوں نے بھی اور غیر کارکنوں نے بھی۔ اب یہ مثالیں عام ہیں۔ لیکن یہ بھی وہ حسین ورثہ ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم نے پایا ہے۔

ایک دفعہ مہمان نوازی کے انتظام میں رات ایک دو بجے کے قریب ایک کارکن کو میں نے کہا آپ جائیں اور آرام کریں۔ وہ چلے گئے۔ نصف گھنٹے کے بعد دیکھا پھر واپس آگئے ہیں۔ میں نے ان سے کہا آپ واپس آگئے ہیں۔ کیا بات ہے آرام کیوں نہیں کیا۔ انہوں نے کہا یہاں زیادہ آرام ہے۔ یہاں کمرہ ہے کرسی ہے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ میرے گھر میں تو اتنے مہمان ہیں کہ دروازہ کھولنے کی بھی گنجائش نہیں رہی۔ جب میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا تھا تو مہمانوں کو تکلیف پہنچتی تھی اس لئے میں واپس آگیا ہوں اور اب رات اسی طرح کٹے گی۔

پس اب یہ مثالیں عام ہوگئی ہیں۔ روحانی حسن کا یہی امتیاز ہے کہ وہ ایک وجود میں محدود نہیں رہتا بلکہ اس شمع سے سینکڑوں ہزاروں شمعیں روشن ہونے لگتی ہیں۔ یہ شمعیں روشن ہو رہی ہیں ہوتی رہی ہیں اور اس دفعہ بھی روشن ہوں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کے ساتھ ہمیں مہمان نوازی کے نہایت ہی اعلیٰ اور حسین تقاضے پورے کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین

(روزنامہ الفضل ربوہ ۱۶؍ جنوری ۱۹۸۳ء)